فطرت اور حقیقت کا شاہ کار.... ''شکست''

پروفیسر علی احمد فاطمی

پریم چند نے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''ناول کو اپنا مواد الماری میں رکھی کتابوں سے نہیں بلکہ ان انسانوں سے لینا چاہئے جو چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔''

اور پریم چند نے یہ کر کے دکھایا۔ ان کے ناول، ان کا مواد بند الماری سے نہیں لیے گئے۔ ان کے کردار چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں نہ صرف گاؤں، دیہات، قصبات میں بلکہ پوری کائنات میں جس سے ناول کی دنیا نہ صرف آباد ہوئی بلکہ پھیل گئی انسانی فطرتوں اور سماجی وسعتوں میں۔ اس کی تقلید کی ترقی پسند ناول نگاروں نے۔ اپنے اپنے منفرد انداز میں۔ پریم چند سے الگ ہونے کے لیے اور ناول کے سفر کو آگے بڑھانے کے لیے یہ انفرادیت ضروری بھی تھی۔ اسی سلسلے کا ایک کامیاب قدم ہے کرشن چندر کا پہلا ناول ''شکست'' (1943) جس نے رومان اور فطرت کا لبادہ ضرور اُڑھ لیا ہے لیکن یہ اصلاً ایک سماجی ناول ہے۔ ہر چند کہ اس سے قبل لندن کی ایک رات، گریز، گئودان جیسے ناول کامیابی کا ریکارڈ توڑ چکے تھے اور ساتھ ہی ناول کے فکری و تکنیکی سفر کو آگے بڑھا چکے تھے ایسے میں کرشن چندر نے اپنا پہلا ناول لکھتے ہوئے اس کی خصوصیت اور انفرادیت کے بارے میں ضرور سوچا ہوگا۔ ایک تو صورت یہ تھی عبدالسلام صدیقی:

"یہ اس دور کا ناول ہے جب سرمایہ دارانہ نظام اپنے پورے شباب پر تھا اور آزادی کی جدوجہد تیز تھی۔ سیاسی وسماجی تحریکیں مسلسل چل رہی تھیں۔ ان سب کا مقصد صرف آزادی حاصل کرنا تھا۔"

آزادی صرف سیاسی نہیں بلکہ سماجی تھی۔ اخلاقی اور انسانی بھی۔ یہ بات اردو فکشن میں ایک مخصوص رومانی اور اشتراکی انداز میں سب سے پہلے کرشن چندر نے سوچی جیسے شاعری میں فیض نے سوچی اور صبح آزادی کے اُجالے میں داغ دیکھ لیا۔ اس طرح کرشن چندر جوان دنوں کشمیر میں تھے انھوں نے کشمیر کی خوب صورتی میں بدصورتی دیکھ لی کہ جس طرح فطرت آزاد ہے، ہوائیں، بادل، چرند پرند آزاد ہیں لیکن خدا کی سب سے بڑی تخلیق حضرتِ انسان اور غریب انسان کئی طرح کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ فرسودہ روایات، ذات پات، امیری غریبی وغیرہ کا قیدی۔ ایک سرمایہ دار کا پورے گاؤں، قصبہ، تحصیل پر قبضہ ہے۔ چناں چہ محبت بھی قید ہے اور جذبہ وشعور بھی۔ اسی لیے کرشن چندر کے اکثر ناول رومان اور فطرت کے حوالے سے سماج کے پیچ وخم پیش کرتے ہیں۔ یہ ناول اسی اسلوبِ فکر اور اسلوبِ بیان میں ڈھلا ہوا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ ناول بہ ظاہر رومانی ہے اور دو نوجوان محبتوں کی ناکامی ہے کہ کرشن رومان کے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھاتے خواہ موضوع کتنا ہی خارجی اور سماجی ہو۔ اس لیے کہ انھیں احساس ہے کہ وہ سماج اور سیاست پر کوئی موضوعاتی کتاب نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ ناول لکھ رہے ہیں اور ناول کا پہلے ناول ہونا لازمی ہے اس کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں لیکن وہ بڑی ہنرمندی سے رومان سے حقیقت اور حقیقت سے اشتراکیت تک پہنچتے ہیں۔

ناول ''شکست'' تین حصوں میں تقسیم ہے۔ تخیل۔ عمل اور زہر آب۔

پہلے باب کی ابتداایک نوجوان کردار شیام سے ہوتی ہے۔ جو ایک خوب صورت وادی سے گزر رہا ہے خوب صورت وادی۔ پیاس اور چشمے کی تلاش۔ چشمہ تو مل گیا لیکن کسی کا ایک جملہ اسے چونکا گیا۔

''اس چشمے میں جونکیں ہیں راہی''

ایک معنی خیز جملہ جو ایک خوب صورت دوشیزہ کا تھا جس کی دوشیزگی میں اس کی چونکاہٹ دب گئی لیکن اُسی دوشیزہ نے پھر آگے بڑھ کر ایک اور معنی خیز جملہ کہا:

''اس چشمے میں جونکیں ہیں جو اندھیرے میں پانی پینے والے اجنبیوں کے حلق میں پھنس جاتی ہیں یا ناک میں چلی جاتی ہیں اور کبھی کبھی دماغ میں بھی..... ''

اجنبی نے سوال کیا.......

''اگر جونک دماغ میں پہنچ جائے تو پھر کیا ہوتا ہے؟''

وہ بولی.......وہی ہوتا ہے جو درخت کو دیمک لگ جانے سے ہوتا ہے۔ درخت گر جاتا ہے دیمک باقی رہتی ہے۔''

دیکھا جائے تو ایک بلیغ اشارہ ہے جو پورے ناول کی تمہید کے طور پر آتا ہے اور تلخیص پیش کر جاتا ہے۔

پانی پینے والا نوجوان شیام ہے اور پلانے والی چندا، ایک اور کردار غلام حسین کا بھی ہے جو اس لڑکی سے تعارف کراتا ہے۔ تعارف کا یہ انداز دیکھئے۔

''یہ لڑکی بڑی حرام زادی ہے۔ کسی سے بیاہ نہیں کرتی۔ کسی کے قابو میں نہیں آتی

اس کی بیوہ ماں کو پٹواری تین ہزار روپے دیتا تھا اس قیمت پر یہ گھوڑی بُری نہ تھی پر یہ کم بخت نہ مانی۔ گاؤں والوں نے ان دونوں ماں بیٹی کو گاؤں سے باہر نکال دیا ہے۔........"

سزا کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی ماں نے برہمن ہو کر چمار سے شادی کر لی تھی۔ چندرا اسی کی لڑکی ہے اور ابتدا میں ہی رومانی کہانی میں ذات برادری کا مسئلہ داخل ہو گیا اور چشمے کے پانی میں جونک نکل آئی۔ ہر خوب صورت منظر میں بدصورت منظر بھی ہے اور یہ صرف اس ناول کا ہی نہیں کرشن چندر کے تقریباً پورے تخلیقی ادب کا مرکز ہے۔ دراصل وہ ان خوب صورت علاقوں، وادیوں، کہساروں وغیرہ میں پنپتے ہوئے بدصورت غیر انسانی وغیر اخلاقی صورتوں کو پیش کرتے ہیں لیکن فکشن کی تزئین کاری اور بے مثال منظر نگاری اکثر کم زور قارئین کو اس لامنظری یا بدصورتی تک پہنچنے نہیں دیتی جو کرشن کا اصل مقصد ہے۔ نظریۂ ادب اور نظریۂ حیات بھی۔

شیام کی گھر واپسی، ماں باپ بہنیں، گاؤں کی بزرگ عورتیں وغیرہ سے ملاقات۔ قصہ کی ابتدا تو شیام اور رونتی کی رومانی ملاقات سے ہوتی ہے جو بے حد خوب صورت انداز میں محبت کا روپ لے لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ رومان اور محبت کی فضا تو انداز و اسلوب تو مختلف ہوگا ہی اور وہ بھی کرشن چندر کا اسلوب جو اپنے ہم عصروں سے جداگانہ ہے۔ جس میں طلسم ہے لیکن یہ طلسم اُس وقت ٹوٹتا ہے جب سماج اور سماجی نظام سامنے آتا ہے۔ یہ جملے دیکھیے:

"سچ ہے محبت کو بھی روٹی کی حاجت ہے....... عشق کو بھی روٹی چاہیے ...." اور یہ سفاک جملہ بھی...... یہ براہمن لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں....."

اور ونتی کا تعارف اس انداز میں۔

''ایمان کی بات ہے کہ یہ عورت بڑی جی دار ہے کیا مجال ہے کسی کے سامنے دبے۔''

کشمیر کے خوب صورت ماحول میں گلاب کی طرح خوب صورت لڑکیوں کے علاوہ غریب طبقہ کی ایسی بھی عورتیں ہیں جن کی زندگی عجیب وغریب ہے۔مسائل، ظلم وستم، فاقہ کشی انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔خواہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو اس لیے کہ ان کے درمیان پنڈت سروپ کشن اور ماسٹر امجد حسین جیسے لوگ بھی رہتے ہیں۔پنڈت سروپ کشن کا تعارف ایک عورت کے ذریعہ یوں سامنے آتا ہے:

''میں نے اپنی زندگی میں ایسا کمینہ آدمی کبھی نہیں دیکھا۔یوں جب دیکھو ماتھے پر تلک وسفید براق اچکن صافہ گلے میں حمائل لبوں پر متین مسکراہٹ، ہمیشہ بگلا بھگت نظر آتے ہیں لیکن بابو جی کیا بتاؤں بس کچھ نہ پوچھئے بڑا بدچلن ہے.......''

نائب تحصیلدار علی چو کی آمد، طب، فلسفہ اور ادب پر عمدہ گفتگو، شکاریات پر بھی لیکن ان امور پر کی جانے والی گفتگو پُر از معلومات تو ہے ہی ناول کے اصل موضوع سے اشارتی تعلق بھی رکھتی ہے کہ اسی گفتگو کے توسط سے سیاسی بیداری کا رشتہ استوار ہوتا ہے اور پھر ایسے جملے:

''رعیت اپنے آپ کو رعیت نہیں سمجھتی.......''

''عوام میں سیاسی بیداری پھیل رہی ہے......''

''شروع سے چند لوگ بہت سے لوگوں پر حکومت کرتے آئے ہیں۔ہمیشہ سے چاہے یہ حکومت جاگیردارانہ ہو یا جمہوریت یا آمریت......''

''حکومت چاہے وہ کیسی ہی ہو جبر واستبداد کے بغیر ایک لمحہ نہیں جی سکتی چاہے یہ حکومت جمہوری ہو یا اشتراکی......''

علی جو نائب تحصیلدار ہے وہ حاکموں کی حمایت میں عوام کی گھیرابندی پر پرانے خیالات رکھتا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے حق میں ہے لیکن شیام نئے خیالات کا ہے۔ وہ علی جو کی گفتگو سے نہ صرف غیر مطمئن بلکہ بے چین ہو اُٹھتا ہے کہ انسانی سماج کی گھیرابندی اسی طرح ہو جس طرح شکار میں جنگل کے جانوروں کا گھیراؤ ہوتا ہے اور لاٹھی بندوق چلائی جاتی ہے صرف شکار کے لطف کے لیے صرف حکومت کے عیش کے لیے۔ شیام ایک اضطرابی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے اپنے آپ سے سوال کرتا ہے:

''کیا یہ ضروری ہے کہ حکومت ہو...... کیا انسان کی زندگی حکومت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ کیا ابھی تک انسان کو خوف کا احساس کرائے بغیر اس سے اچھا کام نہیں کروایا جا سکتا۔''

خیالات اور بھی ہیں۔ گڈمڈ، اُلجھے ہوئے لیکن جسے اُلجھایا انسان نے ہی، بڑھتے ہوئے علم نے علم کے غلط استعمال نے، ترقی پسند خیالات نے بھی، پھر بھی جبر واستبداد کی کمی نہیں ہوئی بلکہ بڑھتی ہی گئی۔ ترقی وتبدیلی کے نام سے، لیکن ایک فن کار کی سوچ کچھ یوں سامنے آتی ہے:

''کیا کوئی ایسی حکومت ہے جو حکومت نہ ہو جو جبر پر قائم نہ ہو جہاں دنیا کے آزاد انسان ایک آزاد انداز سے ایک دوسرے سے آزاد تعاون کر سکیں۔''

اور پھر نوجوان انقلابی کا یہ خیال بھی:

''شاید اس منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے انھیں اشترا کی رہ گزار پر چلنا ہوگا۔''

لیکن ابھی اس میں ''شاید'' لگا ہوا ہے۔ اس لیے علی جو جیسے تحصیلدار یا حکومت میں بیٹھے ہوئے لوگ اس راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اس اضطراب یا پیچ وتاب کے عالم میں شیام کی جو کیفیت ہوتی ہے اسے مصنف اپنے مخصوص منظریہ صلاحیت کے ذریعہ یوں پیش کرتے ہیں۔

''وہ خیمے کا فلیپ کھول کر باہر نکل آیا کیوں کہ خیمے کے اندر اسے اپنا دم گھٹتا ہوا معلوم ہو رہا تھا اور ایک آرام کرسی پر دراز ہوگیا۔ سامنے دوسری کرسی پر نائب تحصیلدار کا شکاری کتا اونگھ رہا تھا۔ اس کی آہٹ پر چونکا، غرایا پھر اسے پہچان کر اُس نے کان ڈھیلے چھوڑ دیے اور اُسی طرح اونگھنے لگا۔''

آگ کے حلقے سے ہلکا سا دھواں بلند ہو رہا تھا کبھی کبھی شعلوں کی زبانیں اُوپر لپک جاتیں۔''

کتے کا اُونگھنا، غرانا اور پھر اُونگھنے لگنا۔ اسی طرح آگ سے دھویں اور کبھی کبھی شعلوں کی لپک..... یہ سب استعارے ہیں جو شیام کی ذہنی کیفیت کو تو ادا کرتے ہیں اس کے خیالات کے زیرو بم اور کیف وکم کو بھی استعاراتی انداز میں ادا کر جاتے ہیں اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ کرشن چندر کی منظر نگاری محض منظر نگاری یا لفاظی نہیں ہوتی بلکہ ان میں ایک خاص اشاراتی کیفیت پنہاں ہوتی ہے جو معنی میں نازک اور لطیف اضافہ کرتی چلتی ہے اور تخلیقیت میں بھی اور فکر وخیال کو جمال وجلال کا باریک سا لبادہ پہناتی چلتی ہے بس اس کیفیت سے دو چار ہونے کی ضرورت ہے۔

کہانی شکار اور شکاریوں، کئی افراد وواقعات کے درمیان سے گزرتی ہوئی اس

طرح کے جملوں کورقم کرتی ہے:

''لیکن وقت تو تیتر کی اُڑان ہے ایک دفعہ زد سے نکل گیا پھر قابو میں نہیں آتا۔''

''سفر کی تھکن ایک سانپ کی کینچلی کی طرح اس کے جسم سے اُتر گئی۔''

''اُس نے اپنے لب چشمے کی سطح سے ملا دیے جیسے وہ چشمے کی دوشیزہ کے لب چومنا چاہتا ہو۔''

''اُس کے اندر وحشی انسان پھر جاگ گیا تھا۔ یہ جنگل کا ہی معجزہ تھا اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی سینکڑوں سال کی محنت سے حاصل ہوئی تہذیب کا ملمع کتنا پتلا تھا۔''

اسی گاؤں اور جنگل میں بربریت ہے تو محبت بھی۔ راجپوت کا وچن بھی اور اچھوت لڑکی کا پیار بھی محبت ہی ایسا جذبہ ہے جو ذات پات نہیں دیکھتا۔ موہن اور اچھوت لڑکی۔۔۔لیکن اصل کہانی تو شیام کی ہے۔ پڑھا لکھا ترقی پسند نوجوان جو کرشن چندر بھی ہوسکتا ہے۔ جس کا رشتہ طے ہوا ہے لیکن وہ تو کسی اور دنیا کا مسافر ہے۔ آسمان کی سپیدی اور بلندی پر اُڑتا ہوا پرندہ جو زمین کو محبت و مساوات کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ شاید اسی لیے اس ناول کی ابتدا جنگل سے ہوتی ہے شکار سے ہوتی ہے کہ یہ زمین یہ سماج بھی جنگل ہو چکا ہے جہاں سب ایک دوسرے کا شکار کر رہے ہیں لیکن وہ غالب کو پڑھتا ہے۔ دنیا کے حسن اور تجسس کو سمجھتا ہے۔ رجائیت پر یقین رکھتا ہے اُمید و نشاط پر اسی لیے سیاہ بادلوں میں بھی اُسے لالی نظر آتی ہے:

''مغربی اُفق کی لالی میں سلسلہ ہائے کوہ کی چوٹیوں کی لکیریں اس قدر صاف نظر آتی ہیں گویا کسی نے پنسل سے ان چوٹیوں کو واضح کر دیا ہو۔ آہستہ آہستہ یہ لکیریں مدھم ہوتی

گئیں۔مغربی آسمان پر بادلوں کے درمیان اب تک سنہری کھڑکی سی بنی نظر آتی ہے۔شاید نیلے آسمان نے اس دنیا کے لوگوں کو مدعو کرنے کے لیے یہ کھڑکی کھول دی تھی۔''

اتنے خوب صورت منظر میں ایک شور بلند ہوتا ہے۔ایک انسانی شور،انسان اور جانور کے درمیان تکرار جو انسان اور انسان کے درمیان بدل جاتی ہے۔جو ایک فطری عمل ہے لیکن فکری عمل میں کچھ دشواریاں تو ہوتی ہی ہیں بہ قول علی جو........

''سینکڑوں برسوں کے آزمائے رسم ورواج دو چار کتابی نظریوں سے نہیں جھٹلائے جاسکتے۔''

مغربی تعلیم عمدہ تو ہے لیکن وہاں بھی ایسا نہیں ہے کہ لارڈ کا لڑکا کسی مزدور لڑکی سے شادی کرلے۔سب لوگ اپنے اپنے دائروں میں رہ کر شادی بیاہ کرتے ہیں۔موہن راجپوت ہے وہ اچھوت لڑکی چندرا سے عشق کرتا آیا ہے جس کی پاداش میں چندرا کو سماج سے نکال دیا گیا۔موہن کو نکالنے کی کسی میں ہمت نہیں اس لیے کہ وہ راجپوت ہے۔سماج ایسا ہی کرتا آیا ہے اس لیے کہ سماج:

''سماج بڑی بھاری طاقت ہے....... سماج انسان کی اجتماعی عقل اور قوت کا دوسرا نام ہے۔سماج سے انحراف کسی صورت میں اچھا نہیں ہوسکتا۔''

معاشرت،مذہب،محبت سے متعلق دنیاداری کی باتیں،ترقی کی راہیں سمجھوتے ،لیکن شیام ان سب سے الگ،وہ حرکت،اضطراب اور بغاوت پر یقین رکھتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ اسی حرکت اور بغاوت کی وجہ سے ہی ہزاروں سال کے سماج نے ترقی کی ہے۔خود مذہب کے پیغمبر بھی باغی ہی تھے اور یہ سوال......اگر زندگی ایک جگہ جم کر بیٹھنے کا

نام ہے تو پھر موت کسے کہتے ہیں۔ اگر انسان کے دل میں اس فطری بغاوت کا شعلہ بلند نہ ہوتا تو وہ شاید آج اسی طرح جنگلوں میں لنگوروں کی طرح دُم لٹکائے ہوئے درختوں پر پھلانگ بھرتا۔ دو طرح کے خیالات، دو رویے و نظریے اور دو نظامِ زندگی اور ان دونوں کے درمیان انسان کی ازلی محبت جو شیام کے ساتھ وقتی شکل میں اُبھرتی ہے جس کی ایک محبوبانہ ہنسی کے آگے سارے فلسفے ہیچ ہو جاتے ہیں وہ بھی فطرت کی آغوش میں کہ انسان کی فطری جبلّت دنیا کی ایک بڑی حقیقت ہوا کرتی ہے۔ کرشن چندر کا کمال یہی ہے کہ ان کی تخلیق میں فطرت، محبت اور حقیقت باہم شیر و شکر ہو کر خلاقانہ انداز میں اُبھرتے ہیں۔ زبان کی دل کشی، منظر نگاری، فطرت کی تصویر کشی یہ سب بے حد فن کارانہ تو ہیں لیکن یہ بھی کہ یہ سارے عناصر خارجی ہیں وہ ان تمام خارجی عناصر سے فکر اور فطرت کا اندرونی رشتہ اُستوار کرتے ہیں ۔انسان کے باطن اور سماج کے اندرون کی نفسیات پیش کرتے ہیں جن میں سوزش ہوتی ہے اور خلش بھی اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہ سارے خارجی عناصر بے کیف اور بے معنی ہو کر رہ جائیں۔ غالباً اسی کو رومانی حقیقت کا نام دیا جا سکتا ہے جو کبھی کبھی دو قدم آگے بڑھ کر اشترکیت کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے اور وہ باب جس کا عنوان تخیل ہے، نیم جذباتی و نیم نظریاتی کیفیت میں ختم ہوتا ہے۔ دوسرے باب میں عمل کی روانی اور کہانی ہے کہ عمل سے ہی رومان سر اُٹھاتا ہے اور حقیقت سے جا ٹکراتا ہے۔ زندگی کے ان تضادات اور تصادمات سے ہی ایسے تصورات کا وجود قائم ہے۔

اس حصہ کا مرکزی کردار پنڈت سروپ کشن ہے۔ جاگیردار، زمین دار، مذہب کا ٹھیکے دار غرض کہ وہ سب کچھ جس سے گاؤں والے دہشت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بے حد

وجیہہ اور شاندار شخصیت کے مالک لیکن ہیرو شیام حیران کہ "اس خوب صورتی کے اندر اتنی سیاہی کیسے ہو سکتی ہے۔" پھر بیوی کا تعارف اور پھر گاؤں کا دلچسپ تعارف ان کے عقائد کا بہ طور خاص' لیکن یہ بھی کہ: "ان کے چہروں سے ان کے خالی الذہن ہونے کا پورا اندازہ ہو جاتا تھا۔" مذہبی سماج کی روایت پرستی اور جاہلیت ان پر پورے طور پر عیاں نظر آتی تھی۔" ایسے لوگوں کے درمیان پنڈت سروپ کشن ایک منصوبہ پیش کرتے ہیں لیکن اس سے قبل یہ جملے:

"سجنو! جیون دو دن کا میلہ ہے اُسے ہنسی خوشی گزار دو لیکن اس کے ساتھ تمھارا فرض ہے کہ زندگی کے اس میلے میں اپنے دھرم سے غافل نہ ہو جاؤ کیوں کہ دھرم سے مکتی پراپت ہوتی ہے۔"

سبھی مذہبی ٹھیکے داروں نے بھرپور تائید کی حالاں کہ اس میں کئی ایسے لوگ تھے جو شلوک کا مطلب نہ سمجھتے تھے جن کا اول ایمان روپیہ تھا اور آخری ایمان بھی روپیہ..... لیکن دھرم کی حفاظت کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھے اسی لیے وہ پنڈت سیروپ کشن کے ہم نوا تھے اور ہمہ تن گوش بھی۔ ان کی اس مصلحت آمیز دنیاوی توجہ کو دیکھ کر بہ قول مصنف:

"پنڈت سروپ کشن کی بھویں اور بھی تن گئیں۔ غلافی پپوٹوں کے نیچے آنکھیں اور بھی بے چین ہو گئیں۔ چندن کا ٹیکا جیسے آگ کا شعلہ بن کر چمکنے لگا۔ کہنے لگے... دھرم کی حفاظت کرنا آپ سب کا فرض ہے۔"

ایک اور بھرپور تائید کی صدا گونجی اور پھر دنیاوی مقصد یوں سامنے آیا۔ پنڈت گرج کر بولے:

وہ بدمعاش چندرا جسے ساری برادری اور آپ نے اس کی ماں کے ساتھ باہر نکال دیا ہے۔آج پھر اسی گاؤں میں آ کر ایک راجپوت کا جنم بھرشٹ کر رہی ہے۔کیا آپ لوگوں کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں ایک راجپوت گھرانے کا ستیاناس ہو رہا ہے اور آپ لوگ اس طرح آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں وہ مسلمان ڈاکٹر بھی اس اچھوت عورت کی طرف داری کر رہا ہے اور آپ لوگ سب دیکھ رہے ہیں اور چپ سادھے بیٹھے ہیں۔اگر یہی حال رہا تو ایک دن اس دھرتی پر ہمارے دھرم کا ناش ہو جائے گا اور اس گاؤں پر پرماتما کا قہر نازل ہوگا۔"

اور مصنف کا ایک جملہ یہ بھی......

"ساری محفل کانپ رہی تھی۔صرف مہاجن لوگ نہایت اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔"

محفل کا کانپنا اور مہاجن کا خاموش رہنا بے حد معنی خیز ہے۔

اور پھر دھرم کے نام پر ایک سازش رچی جاتی ہے اور کہانی آگے بڑھتی ہے۔موہن چندرا کا عشق،ذات پات کا فرق،دھرم کو سنکٹ میں آنا ہی تھا۔اُس سے زیادہ پنڈت کا وقار،اقتدار اور اُس نچلی ذات کی عورت سے پنڈت کا پوشیدہ پیار،لیکن اُسی سنگین ماحول میں پنڈت کی بیوی کو کسی اور سے پیار، پیار کا جذبہ،فلسفہ عجیب وغریب، پیار نہ دیکھے ذات اور پات جیسے بھوک نے دیکھے باسی بھات۔

ایک طرف سماج میں ایسے لوگ ہیں،دقیانوسی،خودغرض اور ہوس پرست۔دوسری طرف شیام ہے نئے خیالات کا شیام،جو مزدورنی سیّداں سے خلوص رکھتا ہے۔درمیان میں ایسے بامعنی تخلیقی جملے جو ناول کی معنویت ورفتار میں اضافہ کرتے ہیں:

''بے چاری سیّداں مزدور عورت کی جوانی کیا ہے۔ سچ مچ ڈھلتی پھری چھاؤں ہے اور دو دن میں ساری آب چمک جاتی رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فطری حسن مشاطگی کا اس قدر محتاج نہیں ہوتا اور مزدور عورت کی جوانی اور خوب صورتی دیر تک قائم نہیں رہنی چاہئے کیوں کہ وہ مزدور ہے کام کرتی ہے اوپر کے طبقے کی عورتوں کی طرح وہ غازہ پاؤڈر کے فیشنوں میں غرق نہیں رہتی۔''

یہ جملے تو مصنف کے ہیں لیکن شیام کی سوچ قدرے مختلف ہے وہ اس طرح سے سوچتا ہے:

''اگر ایسی عورت کو دن بھر مشقت کرنے کے بعد پیٹ بھر کھانا نہ ملے تو پھر؟ شیام نے ایسی عورت نہ دیکھی تھی جو کھانا پکائے بغیر اپنے حسن کی آب وتاب کو برقرار رکھ سکتی ہو۔ گو بعض لوگوں کے ذہن میں سچی خوب صورتی کی یہی معراج ہے۔''

پھر کچھ اور کار آمد، ترقی پسند طنز آمیز جملے جو ظاہر ہے کہ کرشن چندر کے ہیں، ترقی پسند کرشن چندر کے کہ عورت کے وجود سے متعلق اُسی عہد تک ایسے حقیقت پسند اور ترقی پسند خیالات اُردو ناول میں نہ کے برابر تھے۔ عورت صرف حسین ہوتی ہے مجبور نہیں۔ عورت کے پاس صرف رخسار ہوتے ہیں پیٹ نہیں۔ اس غلط سوچ یا عدم توازن احساس کے لیے شیام کی ایک ہی سوچ تھی:

''اس کے لیے شاید اسی سماج کے سارے نظام کو بدلنا ہوگا اگر دنیا میں وہ خوب صورتی چاہتا ہے تو یہ خوب صورتی بھی موجودہ جاہل نظام کو تبدیل کیے بغیر حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ حسین عورت کے خوب صورت ہونٹوں کا ذکر کرتے ہوئے اُن ہونٹوں کے اندر پنہاں

بھوک کا ذکر کرنا بھی ضروری ہوگا۔"

لیکن بھرے پیٹ کے لوگوں کی حکومت تو بھوک پر ہی ہوتی ہے۔ مفلسی اور ناداری پر...... اور وہ اسی لیے اس کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ نظام میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتے۔

اور پھر شیام اور سیّداں کے درمیان موہن اور چندرا کا قصہ داخل ہوتا ہے۔ ناول کا اصل بلکہ وہ منصوبہ جو بہ قول سیداں ۔۔۔ "یہ پنڈت سروپ کشن بڑا چالاک ہے۔ ایسی سازش کھڑی کرتا ہے کہ اس کے جال سے کوئی نہ نکلے......"

شیام بے حد فکر مند تھا۔ اب چاندنی بھی پھیکی تھی اور بادلوں پر بھی میلا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ درختوں کی شاخیں بھی ساکت، جمود کا یہ منظر احساسات کی تصویر بن کر ناول کی سنگینی اور کہانی کو حساس اور معنی خیز بناتا چلتا ہے اور یہی کرشن چندر کے اسلوب کی خوبی ہے کہ وہ منظروں سے بھی کہانی کو بنتے چلتے ہیں۔ منظروں کی یہ لا منظری شیام کی بے چینی کا استعارہ بن کر اُبھرتی ہے۔ بات صرف شیام اور کشن کی نہ تھی بلکہ پُرانی اور نئی سوچ کی تھی۔ قدروں کی اُس سے زیادہ اقتدار کی۔ یہ بات ابتدا میں شیام سمجھ نہیں پاتا اس لیے بار بار اپنے آپ سے سوال کرتا ہے۔

"کس لیے سروپ کشن یہ ہاری ہوئی لڑائی لڑ رہا ہے۔ کس طرح وہ سازش مکروفریب کے داؤ چلا کر تاریخ کے اس پہاڑ کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا جو ایک سیلابِ عظیم کی صورت میں جمہور کے ضمیر پر چھا رہا تھا اور پرانی قدروں، روایتوں اور ریتوں کی خس وخاشاک کی طرح بہائے جا رہا تھا۔"

اور اس مقام پر کرشن چندر جذباتی ہو کر شیام کی زبان میں کچھ زیادہ ہی ترقی پسند

ہو جاتے ہیں۔ عالم تنہائی اور بسترِ خواب پر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے وہ کبھی شیام اور کبھی چندرا کی زبان سے ایسے جملے لکھ جاتے ہیں:

اُسے (چندرا) گاؤں والوں، برادری، مہاجنوں، برہمنوں، سرکاری عہدے داروں پنڈت سروپ کشن پر اعتبار نہ تھا۔ سب ظالم تھے۔"

اور اس نوع کا جملہ بھی:

"پرماتما گواہ ہوتے تو برادری کو ہماری شادی کیوں نہ تسلیم کرتی لیکن پرماتما کی گواہی آج کل کوئی نہیں مانتا۔ برادری کی رضامندی ہونی چاہیے....."

لیکن چندرا میں بغاوت کا مادہ ہے اس لیے کہ وہ جوان ہے اور موہن کی محبت میں شرابور لیکن اس کی ماں بوڑھی ہے تجربہ کار ہے اور برادری سے خوف زدہ ہے لیکن کرشن خوف کو جلد ہی رومان میں بدل دیتے ہیں چندرا اور نوراں کے غسل کے منظر میں آزادی کی کھلی دھوپ ہے۔ ماں کی نظروں میں خوف کا دھواں۔ یہی رنگ سماج کے ہوا کرتے ہیں اور یہی زندگی کے بھی۔ لیکن فطرت کے رنگ کچھ اور ہوتے ہیں جو فطرت اور محنت کے قریب ہوگا وہ کسان ہوگا یا انسان ہندو مسلمان نہیں کہ زمین کا دامن تو انسانوں کی طرح تنگ نہیں۔ یہ جملے دیکھیے:

"یہ گھاس زمین، آدمی دراصل جتنا زمین کے قریب ہوتا ہے اتنا ہی دوسرے انسانوں کے قریب ہوتا ہے۔ اس وقت مشر گنگو اور کریم مالی اور موجود بھنگی ایک ہی قطار میں بیٹھے ہوئے ساتھ ساتھ کام کر رہے تھے کہیں مغائرت کا شائبہ تک بھی نظر نہ آتا تھا۔"

مسئلہ یہی ہے کہ انسان فطرت کے قریب کم انسانی فطرت کے قریب زیادہ ہوتا ہے جہاں

ہو جاتے ہیں۔عالم تنہائی اور بسترِ خواب پر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔شاید اسی لیے وہ کبھی شیام اور کبھی چندرا کی زبان سے ایسے جملے لکھ جاتے ہیں:

اُسے (چندرا) گاؤں والوں، برادری، مہاجنوں، برہمنوں، سرکاری عہدے داروں پنڈت سروپ کشن پر اعتبار نہ تھا۔سب ظالم تھے۔"

اور اس نوع کا جملہ بھی:

"پرماتما گواہ ہوتے تو برادری کو ہماری شادی کیوں نہ تسلیم کرتی لیکن پرماتما کی گواہی آج کل کوئی نہیں مانتا۔ برادری کی رضامندی ہونی چاہئے....."

لیکن چندرا میں بغاوت کا مادہ ہے اس لیے کہ وہ جوان ہے اور موہن کی محبت میں شرابور لیکن اس کی ماں بوڑھی ہے تجربہ کار ہے اور برادری سے خوف زدہ ہے لیکن کرشن خوف کو جلد ہی رومان میں بدل دیتے ہیں چندرا اور نوراں کے غسل کے منظر میں آزادی کی کھلی دھوپ ہے۔ماں کی نظروں میں خوف کا دھواں۔یہی رنگ سماج کے ہوا کرتے ہیں اور یہی زندگی کے بھی۔لیکن فطرت کے رنگ کچھ اور ہوتے ہیں جو فطرت اور محنت کے قریب ہوگا وہ کسان ہوگا یا انسان ہندو مسلمان نہیں کہ زمین کا دامن تو انسانوں کی طرح تنگ نہیں۔یہ جملے دیکھئے:

"یہ گھاس زمین، آدمی دراصل جتنا زمین کے قریب ہوتا ہے اتنا ہی دوسرے انسانوں کے قریب ہوتا ہے۔اس وقت مشر گنگو اور کریم مالی اور موجود بھنگی ایک ہی قطار میں بیٹھے ہوئے ساتھ ساتھ کام کر رہے تھے کہیں مغائرت کا شائبہ تک بھی نظر نہ آتا تھا۔"

مسئلہ یہی ہے کہ انسان فطرت کے قریب کم انسانی فطرت کے قریب زیادہ ہوتا ہے جہاں

انسانی طاقت ودولت سب کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے جو غیر فطری ہے اور فطرت وغیر فطرت کی یہ کشمکش ہی کرشن چندر کا اصل موضوع ہے اور ناول کا بھی۔ یہ جملے بھی ملاحظہ کرتے چلیے:

''درانتی کسان کا قلم ہے اُس سے وہ زمین کی تختی پر لکھتا تھا اور ایسے گل بوٹے بناتا تھا کہ دنیا کے سارے ادیب سارے مصور اور دنیا کے سارے سیاست داں اس کے خوشہ چیں معلوم ہوتے ہیں۔''

شیام پہلی بار درانتی چلا رہا تھا اور دھرتی گیت گا رہی تھی کہ اسی درمیان محبت جاگ اُٹھی۔ محبت اور محنت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ناول تھوڑی دیر کے لیے محنت اور محبت کے ماحول میں آگے بڑھتا ہے اور کرشن چندر نے اسے بڑے سلیقہ اور محبت سے پیش کیا ہے کہ سوئے اور تھکے ہوئے انسانوں کے چہروں پر چاند چمکنے لگتا ہے۔ فی الحال اُنھیں کوئی خطرہ نہیں کوئی بے چینی نہیں۔ ''خطرہ وہاں ہوتا ہے جہاں بنگلے بنے ہوتے ہیں اور ان کے باہر چوکیدار پہرہ دیتے ہیں۔'' جہاں محنت ومحبت ہو اور نفرت وعداوت نہ ہو یہ ممکن نہیں کہ ان کے بغیر کوئی قصہ، کوئی علاقہ اور کوئی بشر خالی نہیں۔ یہ بھی انسانی فطرت ہے چناں چہ جلد ہی ناول کشاکش کو پھر سے سمیٹتا ہے۔

شیام اور غلام حسین کا رشتہ الگ ہے اور شیام علی جو کا رشتہ الگ۔ علی جو جہاں دیدہ انسان ہے اور دنیا کی اونچ نیچ سے واقف ہے کیوں نہ ہو وہ نائب تحصیلدار ہے سماج اور معاشرہ کو اچھی طرح سے سمجھتا ہے اس لیے درمیان میں نہایت تجربہ کی باتیں کہتا چلتا ہے۔ نوجوان شیام کے جذبات وخیالات کی قدر تو کرتا ہے لیکن درمیان میں ایسے جملے

بھی کہتا چلتا ہے:

''بات دراصل یہ ہے شیام صاحب، کہ دنیا میں ہر ایک جامع مکمل اور صحیح چیز ہمیشہ درست نہیں مانی جاتی اور جہاں فرقے وار سوال پیدا ہو جائے وہاں بد قسمتی سے لوگ دلائل کے بجائے ہمیشہ جذبات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے آپ ابھی نوجوان ہیں کالج میں پڑھتے ہیں آپ کو ابھی ان باتوں کا تجربہ نہیں ہے۔''

اور ساتھ میں یہ بھی......

''پانچ سال سے میری ترقی رُکی ہوئی ہے، محض مسلمان ہونے کی وجہ سے مجھے تحصیلدار نہیں بنایا جا رہا ہے....... کئی نالائق ہندو........''

وہ چپ ہو گیا، پھر قدرے توقف کے بعد بولا......

''میں مانتا ہوں کہ یہ تعصب دونوں فرقوں میں پایا جاتا ہے۔ ہندو مسلمان کا گلا گھونٹنے سے پرہیز نہیں کرتا اور مسلمان کا بھی اگر بس چلے تو اسے زک پہنچائے بغیر نہیں رہتا۔''

لیکن شیام پھر بھی کہتا ہے کہ یہ معاملات مذہبی نہیں اقتصادی ہیں اور یہ بلیغ جملہ بھی:

''مذہب کی رفعتوں کو بھی اس مہاجنی دور نے اپنی پہلی گرفت میں لے لیا ہے۔''

اور آگے یہ سیاسی نوعیت کے جملے دیکھئے:

''زندگی چاہے وہ ہندو کی ہو یا مسلمان کی اقتصادیات کے پیمانہ پر تُلتی ہے اور یہ ایک طرح سے لازمی اور ضروری ہے۔ مشینوں کے زمانے میں اس سے بہتر اور کون سا پیمانہ ہو سکتا ہے۔ ہندو مسلم سوال بھی جب حل ہوگا۔ اسی پیمانے پر تُل کر حل ہوگا۔ محض ایک دوسرے کو بھائی بھائی کہہ دینے سے حل نہ ہوگا۔ بھائیوں کے حقوق ہوتے ہیں...... اس

تصفیہ کے بغیر دو بھائی چین سے نہیں رہ سکتے۔"

سوال در سوال، جواب در جواب ،زندگی کے مسائل،محنت کے الگ،سیاست کے الگ،انسانیت کے الگ لیکن شیام انسانیت پر یقین رکھتا ہے تبھی تو کہتا ہے:

"میں ہندو و مسلمان تو کیا دنیا بھر کے انسانوں کو بھائی سمجھتا ہوں اور انھیں الگ دیکھنے کے بجائے اکھٹا مل جل کے امن و آشتی سے ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ کرتے ہوئے ایک بہتر تہذیب ،ایک بہتر نظامِ زندگی ،ایک بہتر فلسفے کی تعمیر کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اور ساتھ میں یہ بھی:

"جب تک ایک انسان دوسرے انسان کو بعینہٖ وہی حقوق نہ دے گا جو وہ اپنے تئیں محفوظ رکھنا چاہتا ہے دنیا میں کبھی امن و امان نہیں ہوسکتا۔"

علی جو دنیا دار تھا اس لیے ایسے آدرش موافق نہ آئے لیکن شیام آدرش وادی ہی نہیں اشتراکی بھی تھا۔زندگی کا ایک تصور رکھتا تھا۔معاشرہ کا ایک متوازن تصور جس سے یہ گاؤں والے ناواقف تھے اور صدیوں کی طاقت اور ناطاقتی کی زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے اوران سب عتاب وعذاب کوانسانی کم الہامی زیادہ سمجھتے تھے لیکن نئی نسل کے نمائندے خواہ وہ شیام ہو یا چندرا فکری اور فطری طور پر باغی تھے۔کرشن چندر نے ان کی بغاوت اور اشتراکیت کو ناول میں ایک دل چسپ قصہ اور ماحول میں پیش کر کے قصہ کو فلسفہ بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے حالاں کہ معاملہ بے حد پیچیدہ ہے۔یہ بات خود شیام بھی سوچتا ہے،علی جو بھی اور خود مصنف بھی۔اس لیے ایک جگہ بے ساختہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں:

"معاملہ بڑا پیچیدہ ہے۔اُس نے سوچا..... خالص درِدِ سر کیوں نہ آدمی اس قسم کی فلسفیانہ باتوں سے کنارہ کشی کرے اور اس قسم کی باتوں پر سوچنے کے بجائے خوب صورت چہروں کے متعلق سوچے خوب صورت جیسے آسمان کے تارے، جیسے ترناری کے مہکتے ہوئے پھول، جیسے پتلے متبسم خمیدہ لب جن کے کنارے ہروقت کسی نامعلوم جذبے کے زیرِ اثر کانپتے رہتے ہیں۔"

اس لیے اس ناول میں خوب صورت چہرے ہیں۔خوب صورت مناظر بھی اور اتنی خوب صورت سلیس زبان اور اسلوب...... لیکن ان مناظر کا تعلق بھی زندگی سے ہی ہے۔محبت کا تعلق انسان سے ہے اور انسان خوب صورت ہوتے ہیں اور بدصورت بھی....... کبھی خوب صورت انسان کے بدصورت اعمال جیسے سروپ کشن جو وجیہہ تو ہے لیکن خبیث بھی اور موہن جو راجپوت ہے لیکن چندرا جیسی معمولی اور کم زور لڑکی کا عاشق اور محافظ۔فطرت کی نیرنگی کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت کی یہ نیرنگی کرشن چندر کے فکر وفن، جمال وجلال کا ایک ایسا بے مثال جوہر ہے جس پر نگاہ عام طور پر نہیں جاتی یا کم جاتی ہے جو بہ ظاہر نظر آتا ہے اکثر وہی زیرِ بحث رہتا ہے لیکن علمی ومعروضی گفتگو تو ان امور پر ہونی چاہیئے جو نظر نہیں آتا یا جو فطرت کے مابین تضاد ہے تصادم ہے اندرون کی کشمکش ہے۔فطری، تہذیبی اور سماجی جن کے حوالے صرف یہ کردار ہی نہیں ہوتے بلکہ فطرت بھی ہوتی ہے۔کرشن کا کمالِ فن فکر وفطرت، محبت اور محنت کی امتزاجی وانجذابی صورتوں میں پوشیدہ ہے جسے تنقید کی کم زور نگاہ، سطحی نظر آسانی سے تلاش نہیں کر پاتی۔کبھی کبھی قلتِ علم بھی آڑے آتی ہے۔انسان شناسی کا فقدان اور طے شدہ اذہان بھی کرشن چندر کی تفہیم میں آڑے آتا ہے۔بہ قول شاعر

جس کو بھاتا ہے اپنی ذات کا رنگ

اس کو کیا بھائے کائنات کا رنگ

تھوڑی دیر کے لیے ناول میں میلے کا ذکر اس سے زیادہ عجیب وغریب کرشمات اور اعتقادات کہ گاؤں دیہات اور پہاڑی علاقوں میں اس کا کچھ زیادہ ہی دخل رہتا ہے۔ وطن کی دیومالا، میکے کی یاد، میلے کا منظر اک عجیب تخلیقی ناسٹالجیا۔ یہ خوب صورت اور معنی خیز جملہ:

''ماضی کی ان حکایتوں اور داستانوں میں بھی پرانے تخیل پرستوں نے زندگی کی بنیادی سچائیوں کو خوب صورت لباس بنا کر پیش کیا تھا۔ گاؤں گاؤں میں فسانوں کے تخیل میں یہ حکایتیں ہمیشہ تازہ رہتی ہیں۔''

لیکن یہ افسوس بھی:

''ان جاہل کسانوں میں انھیں نئی قدروں سے پرکھنے والا کوئی نہیں اور وہ راہ حکایتوں کی مبالغہ آرائی پر ایمان لا کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔''

یا گمراہ کر دیا جاتا ہے۔ اس گمرہی کے عجب کھیل ہیں۔ کشتی کے کھیل، بازار کے کھیل جو زندگی بن جاتے ہیں۔ یہ ناول کا محض ایک رنگ ہے جو اس کے مرکزی خیال کو آگے بڑھاتا ہے۔ اس کے بعد شیام کی شادی، ماں باپ، ذات پات سب ایک طرف دوسری طرف شیام کا عشق اور اصول تکرار کی صورت، ماں کے آنسو، جذبات کے آگے نظریات کی شکست لیکن سماجی نظریات بہ دستور قائم رہتے ہیں۔ ناول سماج کی ناہمواریوں، کج بحثیوں کو طرح طرح سے پیش کرتے ہوئے کہیں کہیں روکھا پھیکا سا بھی ہو جاتا ہے لیکن کہیں کہیں معنی خیز جملے غور کرنے پر مجبور کرتے ہیں لیکن پیار زندہ رہتا ہے۔ شیام اور ونتی کا پیار لیکن سماجی پیچ

وغم پیار میں تکرار پیدا ہی کر دیتے ہیں اور ناول عمل سے تعلق رکھنے والا باب دو بھر پور تضادات پر ختم ہوتا ہے۔ایک طرف جذبۂ محبت میں ونتی کا شیام سے چمٹ جانا اور اس کے فوراً بعد:

''دو اخروٹ کے درختوں کی قطار سے پرے شیام نے درگا داس کو گھسیٹتے ہوئے دیکھا اس کے ساتھ اس کا باپ تھا۔پنڈت سروپ کشن، ونتی کا ماما روشن اور تینوں ساتھ ساتھ چلتے باتوں میں منہمک تھے.......اور شیام کا دل کسی نامعلوم خوف سے بھر گیا۔یکا یک درخت کی شاخوں سے ایک ہڑ با گڑ چیخ مار کر اُٹھا اور اپنے سیاہ پر پھیلائے نیچے گھاٹی کی فضا پر تیرتا ہوا غائب ہو گیا۔''

ناول کا اگلا اور آخری باب ''زہر آب'' ہے۔عنوان سے ظاہر ہے کہ اس محبت کا انجام کیا ہوگا۔باب کی ابتدا تو موہن اور چندرا کی محبت کی تحقیقات سے ہوتی ہے۔پورا گاؤں پس و پیش میں دہشت میں ہے کہیں کہیں مذہبی عصبیت بھی لیکن چندرا اور موہن کی محبت پختہ کو کوئی خوف نہیں کہ شیام کو بھی اس ارادہ و اعتماد پر رشک آیا اور رشک شیام کو بھی اعتماد بخشتا ہے۔

مذہبی چندرا اور شیام ونتی کی محبت گاؤں کی طاقت، عصبیت، دین دھرم، ذات پات کے چکرویوہ میں پھنسی تھی اور یہی جان سازی، ذات اور برادری، تنگ نظری طاقت اور ناطاقت کا کھیل ہی اس ناول کا اصل موضوع ہے۔ایسی پیچیدہ صورت میں دونوں مرد یعنی موہن اور شیام فکر مند ہیں کہ کس طرح ان مکروہ و مجبور صورتوں کا سامنا کیا جائے۔
بہ قول مصنف:

''یہاں اس کی اپنی (شیام) ہستی اور اس کی اپنی بقا کا سوال تھا وہ کیا لائحہ کار

اختیار کرے۔"

بات صرف محبت یا شادی کی نہ تھی بلکہ اس جہالت وتنگ نظری کی تھی جوان کے نظامِ فکر اور نظامِ زندگی کا ناگزیر حصہ بنی ہوئی تھی جس کا فائدہ اونچی ذات یا سرمایہ دار قسم کے لوگ اُٹھاتے آئے ہیں۔ذاتی مفادات کے لیے مذہب اور ریت رواج کی دہائی دیتے رہے ہیں۔شیام کے یہاں عشق کے تصورات بھی مختلف تھے تاہم اُس کے سامنے یہ سوالات تو تھے ہی:

"تو پھر وہ کیا کرے۔چپ چاپ بیٹھا رہے اور سماج کے آہنی ہاتھ کو اس خوب صورتی،اس تابانی،اس جمالیت کا گلا گھونٹتے ہوئے چپ چاپ بیٹھا رہے اور بدصورتی کی زندگی آنکھ کو اپنی حیاتِ نو کی درخشاں وسعتوں پر ایک تاریک اور ہولناک ہیولیٰ تین مستور کرتے دیکھ چپ چاپ بیٹھا رہے اور پرانی روایت اور اوہام کے لنگڑے بھوت کو اپنی خوشیوں اور مسرتوں کی قبر پر ناچتا دیکھے۔"

لیکن مسئلہ یہ بھی کہ ایک طرف پورا جاہل اور فرسودہ سماج اور دوسری طرف وہ اکیلا اور بے روزگار زندگی کی کچھ اور مجبوریاں...... ناول انھیں سوالات اور کشمکش کے درمیان سے گزرتا ہوا شیام کے غم وغصہ کی کیفیت میں پہنچتا ہے اور اپنے بارے میں کم موہن اور چندرا کے بارے میں زیادہ سوچنے لگتا ہے اور ناول بے حد ڈرامائی انداز میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ٹھاکر کے ہاتھوں ایک برہمن پر قاتلانہ حملہ واویلا،اچھوت عورت کا مذاق،آنسو،مقدمہ،جیل وغیرہ کے تذکرے۔موہن چندرا کی محبت صلیب پر لیکن ایسے سنگین حالات میں بھی چندرا کی دلیری قابلِ دید اور قابلِ مثال بھی چناں چہ وہ بھی تھانے دار سے

دلیری کے ساتھ کہتا ہے:

''کیا آپ ایک انسان کی عزت اور مرتبے سے واقف نہیں اور آپ کیا سمجھتے ہیں کہ محبت کیا ہوتی ہے..... زندگی بڑی عجیب شے ہے۔ یہ قانون اور عشق اور ظلم بھی بہت عجیب اور دل چسپ .....''

زخمی موہن سنگھ کی موت ہو جاتی ہے اور ناول المناک صورتوں سے دوچار ہوتا ہے:

''دروازہ کھلا ہے اور موہن سنگھ مر گیا ہے لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ کائنات اسی طرح چل رہی ہے۔ موہن سنگھ مر گیا اور ساری دنیا اُسی طرح زندہ ہے۔''

ایک عشق کا یہ المناک انجام، عاشق کی موت، دوسرے عشق کا بھی المناک انجام، معشوقہ کی موت، موت اور فطرت کا یہ حسین امتزاج دیکھئے۔

''وہ ایک برف کی مورت کی طرح اس شہتوت کے تنے کے نیچے پڑی تھی اور ڈال ڈال پات پات ہرے ہرے چلا رہے تھے۔ ونتی اُٹھ، ونتی جاگ، ونتی تیرے محبوب کا شگن ہے۔ دیکھ دھواں پہاڑوں پر پھیل رہا ہے۔ سورج کا سونا چاندی کی آنکھوں میں چمک رہا ہے۔ لیکن ونتی کو فرصتِ نظارہ کہاں تھی اُس نے کسی کی طرف لپک کر اُٹھ کر بھی نہ دیکھا اور چپ چاپ برف کے گلیشیر کی طرف بڑھتی گئی۔''

زندگی اور موت، محبت اور نفرت، فطرت اور انسانی فطرت اور اُس کے پیچ وخم، چتا کے شعلے لیکن ہوا خاموش تھی۔ پیڑ کے پتے جھڑ چکے تھے اور انسان..... انسان کم بھوت زیادہ لگ رہے تھے اور اس جملہ پر ناول کا خاتمہ:

''ان زندہ بھوتوں کے درمیان ایک خاموش چتا جل رہی تھی اور شفتالو کا درخت

فطری تھا۔ چناں چہ ان کا یہ پہلا ناول بھی اس کشمیر کے گاؤں کے پس منظر میں لکھا گیا۔ اچھی بات یہ ہے کہ کرشن بڑے سلیقہ اور منصوبہ سے فطرت کو فکر اور فکر کو فطرت میں بدلنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ہندی کے ممتاز ادیب و ناول نگار رابل نے کہا تھا کہ سماج کو بدلنا ہے تو اپنے آپ کو، سماج کو اور فطرت کو گہرائی سے سمجھو اور بھاگو نہیں دنیا کو بدلو..... انگریزی کے رومانی شعرا بھی فطرت نگاری کو محض منظر نگاری تک محدود نہیں رکھتے بلکہ فطرت کو انسانی فطرت سے قریب کر دیتے ہیں اُس فطرت کو جس کے بارے میں روسو نے کہا تھا کہ انسان فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے لیکن سماج کی رسمیں روایتیں اُس کے پیروں میں زنجیر ڈال دیتی ہیں۔ یہ ناول اُس کا قصہ، پلاٹ، کردار روسو کے اس خیال کی بہترین نمائندگی کرتا ہے اور اس کی فطرت نگاری، آزادی، خوش حالی کی فطرت سے ہم آہنگ ہوجاتی ہے۔ اسی لیے جا بہ جا اُڑتے ہوئے بادل ہیں۔ کھلا آسمان ہے۔ چرند پرند ہیں، پیڑ پودے ہیں یہ سب کے سب استعاراتی انداز میں کہانی کی سمت و رفتار اور فکر و خیال میں جذب و پیوست ہوجاتے ہیں اور خیال کو جمال کے ساتھ ساتھ جلال کی ادا بھی بخش جاتے ہیں۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ دو موتوں نے اس ناول کو المیہ سے دوچار کر دیا ہے اور وہ طربیہ نظر نہیں آتا ہے جو بعد کو کرشن چندر کی فکر کا لازمی حصہ بنا۔ اس پر بحث ہوسکتی ہے لیکن یہاں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ المیہ کے نظریاتی پہلو جو بھی ہوں لیکن اکثر جذباتی پہلو نہ صرف ناول کی تاثیر میں اضافہ کرتا ہے بلکہ کبھی کبھی تزکیۂ نفس کی منزل پر لے جاتا ہے اور غور و فکر کی ایک نئی بشارت سے دوچار کرتا ہے۔ اس حوالہ سے یہ ناول اپنے المیہ میں بھی ایک نئی تعبیر و تفسیر پوشیدہ رکھتا ہے ورنہ اس پر رسمی و معمولی رومانیت یا مثالیت کا الزام بھی آسکتا تھا

اور قصہ کا فطری پن بھی متاثر ہو سکتا تھا۔ اس اعتبار سے کرشن کا یہ پہلا ناول ہی اپنی کامیابیوں اور بلندیوں کو چھونے لگتا ہے جس سے نہ صرف کرشن چندر کی اشتراکیت بلکہ خلاقیت بھی کچھ اس انداز سے روبرو بلکہ سرزد ہوئی جس نے آگے بڑھ کر کامیابی کے کئی نشانات ثبت کیے۔

اگر عادل کے تخلیقی تخیل کے امتیازی وصف کی نشان دہی مقصود ہو تو اس کے شعری پیکروں کی یکتائی کو اس کے اظہار بیان کی سب سے بڑی خوبی گردانا جا سکتا ہے۔ ان پیکروں کی تعمیر میں شاعر کا سرریئلی تخیل، گھلتے ملتے رنگوں کی نقش گری اور اسلوب کے چوکھے پن کا بڑا عطیہ ہے۔ عادل مصور بھی ہے اور اس کی تصویریں سرر ماہیت کم اور تجریدی زیادہ ہیں۔ عادل کی آواز میں بڑی کڑک ہے اور اسی کڑک کی گونج اس کی زبان اور اسلوب میں نظر آتی ہے۔ عادل کی نظم میں نثر کا عنصر بالکل نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ ایک دو مصرعوں میں صاف وشفاف طریقہ پر اظہار خیال وجذبات کرتا ہو اور پھر استعاروں اور شعری پیکروں کا عمل شروع ہوتا ہو۔ اس کی پوری نظم کا ایک ایک مصرعہ استعارے اور شعری پیکر سے بھرا ہوا ہے۔ اس کی ہر نظم کا اسلوب اول تا آخر استعارہ سازی کا ہے۔ ہر مصرعہ ایک استعارہ ہے۔ اور استعارہ شعری پیکر میں اور شعری پیکر سرریئلی تصویر میں بدل جاتا ہے۔ نظم اول تا آخر اتنے پیچیدہ اور گہن تخیل کو برداشت نہیں کر پاتی۔ پہلے ابہام اور پھر اشکال اور اکثر نظموں میں پھر اہمال پیدا ہو جاتا ہے۔ عادل کی چند نظمیں طویل ہیں۔ باقی مختصر ہیں جو ایک صفحہ پر ختم ہو جاتی ہیں۔ سب نظموں پر عنوانات ہیں لیکن کسی بھی نظم کو دوسری سے الگ ایک علاحدہ اکائی کے طور پر دیکھنا لگ بھگ ناممکن ہے۔ تمام نظمیں ایک سی لگتی ہیں۔ پھر نظم کو آپ کہیں سے بھی شروع کر سکتے ہیں۔ اس کا آغاز درمیان اور انجام نہیں ہوتا ہے۔ چوں کہ معنی کا کوئی تسلسل نہیں اور شاعر نے معنی کے ماورا جا کر بے معنی کی منزلیں طے کر کے ایسے معنی کی تخلیق کی کوشش کی ہے جو ہمیں کبھی بھی دستیاب نہ ہوتا اگر ہم معنی میں قید شاعری کرتے رہتے۔ **(وارث علوی: اقتباس: عادل منصوری کی شاعری پر ایک نظر)**

سہ ماہی ادبی و تہذیبی مجلہ
29
اذکار
کرناٹک اردو اکادمی بنگلور

سہ ماہی

اذکار

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

مدیر

اکرم نقاش

کرناٹک اُردو اکادمی بنگلور

AZKAAR
QUARTERLY URDU LITERARY JOURNAL
ISSUE: 29 O 2015

Chief Editor: **Dr. Fouzia Choudhry**
Editor: **Akram Naqqash**
Publisher: **Karnatka Urdu Academy**
Kannada Bhavan, J.C. Road, Bangalore-560002

اذکار

شمارہ (29)

کمپوزنگ : حسن محمود

سرنامے کی خطاطی : اکرم نقاش

سرورق : سید مشتاق فاروق

قیمت : 100 روپے

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

کرناٹک اُردو اکادمی، کنڑا بھون، جے سی روڈ، بنگلور۔560002

فون / فیکس: 08022213167

Email:

karnatakaurduacademy@gmail.com
drfouziachoudhary@gmail.com
akramnaqqash61@yahoo.com
akramnaqqash74@gmail.com

مشمولات

مضامین

فکشن

گفتگو